اختر بستوی



اختر بستوی

پورا نام: محمد اختر علی صدیقی
پیدائش: ۸ اگست ۱۹۳۸ء
تعلیم: ایم۔ اے (انگریزی)
پیشہ: تدریس
پتہ: روشن محل۔ گاندھی نگر بستی (یو۔پی)

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

نغمۂ شب

(ایک طویل نظم)

اختر بستوی

ایم۔ اے

شب خون کتاب گھر

۳۱۳۔ رانی منڈی۔ الہ آباد۔ ۳

باراول: ۱۹۶۹ء

قیمت: ۲ روپے

ناشر: سید رشید قادر

طابع: نیشنل آرٹ پرنٹرس - الہ آباد-۳

سرورق کا پرنٹر: الہ آباد پریس - الہ آباد-۳

سرورق: محمد مسلم بستوی

خطاط: ریاض احمد

رات کے نام

جو

میری محبوبہ ہے

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

اختر صاحب کی طویل نظم 'نغمۂ شب' اقبال کی نظم خضر راہ کی یاد دلاتی ہے۔ طوالت بیان و انداز فکر کے لحاظ سے بھی ایک بڑی حد تک مماثلت ہے۔ اقبال نے حضرت خضر کی زبان سے دنیا و اہل دنیا کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور اختر صاحب نے رات کو مشخص، بناکر اپنے خیال کا آئینہ دار کیا ہے۔ یہ تقلید یا تخلیق باعث مسرت ہے۔ زندگی و اہل زندگی کے کارنامے جس جس طرح سے روز روشن میں آسکیں ادب و انسان کے لئے کار آمد ثابت ہوں گے۔

اختر صاحب کی نظم کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ حیات و ممات کے ضروری پہلوؤں پر موصوف نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ زندگی کے کرب اور پراگندگی روزگار کے اسباب کا بڑے سلیقے سے تجزیہ کیا ہے۔ کیوں انسان مجبور ہو جاتا ہے اور کس طرح لوٹ مار سے سرمایہ دار خوش حال بنتا ہے۔ یہ آج کے زندگی

کے اہم ترین مسائل ہیں جو ان کے اشعار میں ہم کو ہر قدم پر نظر آتے ہیں خاص بات ہے کہ شاعر نے کہیں ناصحانہ انداز نہیں اختیار کیا۔ ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ٹوٹے ہوئے دل اور ستم رسیدہ کی زبان سے تلخ و ترش حالات ہم سن رہے ہیں۔ ہم ہی میں سے کوئی مجروح انسان اپنی زندگی کی داستان سنا رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے، جہاں جی چاہتا ہے کہ استحصال کے رنگ محل میں آگ لگا دی جائے اور اس کے خاکستر پر ایک جہان نو تعمیر کیا جائے جو سب کا جہان ہو، جس میں زندگی خود یہ محسوس کرے کہ اب حیات کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔

شاعرانہ لحاظ سے اختر صاحب کی یہ نظم بڑی دل کش ہے۔ بحر کی لچک، انداز گفتار کی نرمی، الفاظ کی دروبست سے ترنم کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جو نظم کو خاصہ کی چیز بنا دیتے ہیں۔ غیر مرئی عوامل کو متشکل بنانے میں شاعر نے اچھی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اہم خصوصیات کی مناسب الفاظ و انداز سے تصویر کشی کر کے نغمہ شب کو سچ مچ نغمہ بنا دیا ہے اگر انسانی زندگی کی پراگندگی و اضمحلال پر نظر کرنا اور اس کے کرب کو محسوس کرنا شاعر کا فرض اولین ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اختر صاحب کی یہ شعری کاوش، سعی مشکور کا درجہ رکھتی ہے۔

نشیمن۔ منٹو روڈ۔ الہ آباد

اعجاز حسین

نغمۂ شب

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

۱

رات کی دیوی اپنی گھنیری زلفوں کو بکھرائے ہوئے
وقت کے در سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی غمگین، اداس
قلب و جگر میں کرب کے زہریلے تیروں کی چبھن لئے
دل میں چھپائے صدیوں کی موہوم تڑپ، انجانی پیاس

اس کے لبوں سے پھوٹ رہا تھا اک مبہم سا نغمۂ غم
سناٹے میں گونج رہی تھی دھیمی دھیمی سی آواز
مگر زمانہ خوابیدہ تھا، دنیا ہوش سے عاری تھی
کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اس پردرد صدا کا راز

روز ازل سے ان ہونٹوں پر گیت مچلتے آئے ہیں
ایسے گیت جو سسکی بن کر گھل جاتے ہیں فضاؤں میں
جن کو اڑا لے جاتا ہے فطرت کا سکوت بے پایاں
آہ و فغاں میں ضم ہو کر جو بس جاتے ہیں ہواؤں میں

یہ نغمات بہ ظاہر لگتے ہیں بے معنی سے ، لیکن
پوشیدہ ہوتے ہیں ان میں کائنات کے راز ہزار
اَن دیکھے زخموں کا روپ بدل کر پلتے رہتے ہیں
سینے کے ویران نہاں خانوں میں ہمیشہ یہ اسرار
دہن سے ان زخموں کے نکلا کرتی ہیں جو آوازیں
انھیں کو نغمے بنا بنا کر رات کی دیوی گاتی ہے
اپنے غموں کے بوجھ کو کچھ ہلکا کرنے کی نیت سے
بار بار سنسار کو درد میں ڈوبا راگ سناتی ہے

دنیا کے لوگوں کو مگر ہوتے ہیں اجالے دن کے عزیز
جن کے سہارے، پیٹ کی خاطر، کرتے ہیں وہ صدہا کام
صبح کی آمد ان کو سدا کر دیتی ہے سرگرم عمل
شام ڈھلے تک پھر آرام کی باتیں بھی ہوتی ہیں حرام
شب کی سیاہی ان کے لئے لاتی ہے اذیت ناک تھکن
روح بھی ہو جاتی ہے ان کی، مثل بدن کے، تھک کر چور
خواب کی نگری میں جا کر ہی بھرتے ہیں محنت کے گھاؤ
ڈوب کے نیند کے ساگر میں اس تھکن کو وہ کرتے ہیں دور

ہوش نہیں رہ جاتا پھر اتنا کہ سنیں شب کے نغمات
عقل و خرد پر چھا جاتی ہے اک گہری مدہوشی سی
کان کے پردوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے ہر آواز
کوئی صدا ہو، ان کے لئے رہتی ہے فقط خاموشی سی

آج بھی رات کی دیوی نے چھیڑا تھا الم انگیز سا گیت
آج بھی اس کے کانپتے لب سے نکلی تھی مترنم آہ
سن کر جس کو چونک پڑی تھیں تیرہ و تار فضائیں بھی
سناٹے کی سانسوں سے بھی چھوٹ پڑی تھی ایک کراہ

آج بھی لیکن انسانوں کی آبادی کا وہی تھا حال

نیند کے جادو میں کھو کر وہ گرد و پیش سے تھی غافل

تھک کر سوئے ہوئے لوگوں کے احساسات تھے سحر زدہ

نغمۂ شب کا سارا تاثر ان کے لئے تھا لا حاصل

۲

اس خفتہ آبادی میں اک دیوانہ شاعر اب تک
جاگ رہا تھا اپنے ادھورے سپنوں کا سنسار لئے
نظروں میں الجھنیں ہزاروں، ماتھے پر شکنوں کا جال
ذہن میں نامعلوم مسائل کے صدہا افکار لئے

دن بھر دنیا داروں کے مانند نہ وہ مشغول رہا

کام کیا بس اتنا ہی بجھ جائے جس سے پیٹ کی آگ

تھکن مشینی دور کی اس پہ اسی لئے حاوی نہ ہوئی

بڑھا نہ اس کی جانب پھن پھیلا کر بے حس نیند کا ناگ

بیداری کی نعمت اس کے پاس ابھی تک تھی محفوظ

غفلت کس کو کہتے ہیں یہ بات نہ تھی اس کو معلوم

ہوش و حواس بھی تھے قابو میں، آنکھیں بھی تھیں کھلی ہوئی

قلب بھی اس کا، ہوا نہ تھا احساس کی دولت سے محروم

ایک پرانے پل کے نیچے کھڑا تھا وہ گم صم، چپ چاپ
دیکھ رہا تھا دور خلا کی تاریکی میں جانے کیا
چشمِ تمنا شاید کہتی تھی "دیکھو فطرت کے روپ"
نظر مگر حیراں تھی اندھیرے میں آخر پہچانے کیا
افق پہ بھی ظلمت تھی چھائی، فضا بھی تھی کجلائی ہوئی
فلک کے نیلے چہرے پر بھی پھیرا ہوا تھا رنگ سیاہ
حدِ نظر تک صاف صاف کچھ بھی نہ دکھائی دیتا تھا
اصلی شکل مناظر کی پہچان نہیں پاتی تھی نگاہ

گھور گھور کر خلا میں جب اکتا سی گئیں بیکل نظریں

عرش سے ناتا توڑ کے اپنا، فرش کی چیزوں تک آئیں

دیدۂ حیراں بن کے انھوں نے دیکھا پل کے ہیولے کو

پھیلی ہوئی تھی زمیں پہ جس کی لمبی چوڑی پرچھائیں

کھڑے کھڑے شاعر نے سوچا عجب ہے اس پل کا بھی حال

برسوں پہلے انسانی ہاتھوں سے ہوئی تشکیل اس کی

پتھر سے اس کو نہ بنایا کیوں کہ وہ تھی ماضی کی چیز

نئی روش کو اپنا کر فولاد سے کی تکمیل اس کی

بات یہ ہے اس وقت کی جب اک دریا بھی تھا یہاں رواں
جس سے عاجز آکر انسانوں نے اس کو کھڑا کیا
دریا سفر میں حائل تھا اور سفر ہے شرط ترقی کی
اسی لئے پانی کو اک فولادی پنجہ عطا کیا
کچھ دن بعد وہ دریا دھرتی کے سینے میں سما گیا
انسانوں کی راہ کا کانٹا اپنے آپ ہی دور ہوا
لوگوں نے اس تبدیلی پر خوشی کا یوں اظہار کیا
گویا ان کا دشمن کوئی مرحوم و مغفور ہوا

مٹا وجود آبِ مصفّا، خشک ہوا پانی، لیکن

فرشِ زمیں پر یہ فولاد کا پل اب تک استادہ ہے

دورِ ترقی کے آئینے یوں تو بہت ہیں مگر، یہ پل

اپنے عہد کی سچی شکل کا منظر سب سے زیادہ ہے

دیکھ کے اس ویران سے پل کو ایسا ہوتا ہے محسوس

جیسے روح نہیں اس میں، بس خالی جسم کا ڈھانچہ ہے

اگر یہی ہے زیست تو ایسے جینے سے بہتر ہے موت

اس کی حیات افسردہ تاریخ کے منھ پہ طمانچہ ہے

لیکن یہ رنجیدہ کیوں ہو وقت نے لے کر رات کی آڑ

انسانوں کی ہستی کو بھی اسی کے جیسا بنا دیا

بے مقصد، ناکارہ، بے حس، غافل سارے زمانے سے

عقل و خرد کے بندوں کو دیکھو تو کیسا بنا دیا

خواب گراں کے دام میں آکر ہوئے ہیں وہ ایسے بے جان

لمحوں کے قدموں کی صدا بھی بے معنی ہے ان کے لئے

کائنات کی سانسیں ہوں یا فطرت کے دل کی دھڑکن

چاہے جیسی بھی آواز ہو لایعنی ہے ان کے لئے

۳

شاعر انھیں خیالوں میں تھا غرق کہ اس کے کانوں نے
سنا وہ گیت جو گونج رہا تھا بن کر اک دکھ بھری پکار
رات کی دیوی کا وہ نغمہ جس میں بسا تھا درد ہی درد
جس کے سروں میں چھپے ہوئے تھے لاکھوں نادیدہ آزار

چونک پڑا اس گیت کو سن کر، قلب پہ اس کے چوٹ لگی

سینے میں محسوس ہوئی بے تابی کے کانٹوں کی چبھن

رنج و الم کی لہریں روح کی گہرائی میں تڑپ اٹھیں

شدت غم سے دل تھرایا، کانپا ہر ہر موئے بدن

ذہن نے سوچا کون ہے اس خاموشی میں یوں نغمہ بہ لب

آنکھوں کو جستجو ہوئی، دوڑائی چاروں سمت نگاہ

دیکھا اپنے ارد گرد بھی، خلا میں بھی ڈھونڈا، لیکن

کہیں بھی کوئی نظر نہ آیا، بھٹکیں نظریں خواہ مخواہ

جھنجھلا کر شاعر نے پکارا گلے کے پورے زور کے ساتھ

چیخ کے پوچھا "کون ہے تو؟ کیوں پوشیدہ ہے نظروں سے؟"

دور دور پہنچی اس کی آواز مگر ناکام رہی

مدغم ہوئی فضا میں، ٹکرا کر ظلمت کے پردوں سے

لیکن اس نے ہار نہ مانی، پیہم دہراتا ہی گیا

ویسے ہی انداز میں، اتنی ہی شدت سے، وہی سوال

بار بار کی بازگشت سے پیدا ہوا کچھ ایسا شور

ہر سو پھیلے ہوئے سکوت میں جس نے دی تھرتھری سی ڈال

آخر ابھری تاریکی سے ایک صدائے نرم و لطیف

"میرے بھولے ساتھی تو کیوں مجھ کو مخاطب کرتا ہے؟

سامنے تیرے آنا بھی چاہوں تو نہیں آسکتی میں

اے نادان تو میری دید کی حسرت میں کیوں مرتا ہے؟

میں ہوں رات کی دیوی، دنیا پر اس وقت ہے میرا راج

قدرت نے میرے قبضے میں دیئے ہیں مریخ و مہتاب

مگر دکھانا تجھ کو اپنی صورت، میرے بس میں نہیں

کیوں کہ ملی ہے مجھ کو حکومت کے بدلے میں قیدِ نقاب

ہم دونوں کے بیچ اندھیروں کی دیواریں حائل ہیں
یہی اندھیرے میرے لئے کرتے ہیں نقاب رخ کا کام
میری اصلی شکل سے انسانی آنکھیں ناواقف ہیں
اسی نقاب کو دے رکھا ہے اہل جہاں نے "رات" کا نام
پابندی منہ چوری کی، یہ سوچ کے کرتی ہوں برداشت
چہرے پر تعزیر سہی، نظریں تو نہیں ہیں قدغن میں
مجھ کو چاہے دیکھ نہ پائیں زمیں پہ رہنے والے لوگ
میں تو سدا دیکھا کرتی ہوں سب کچھ دہر کے آنگن میں

چشمِ بصیرت کی مالک ہوں، دیدۂ بینا رکھتی ہوں

پائی ہے میں نے ایسی نعمت جس کا کوئی نہیں جواب

لیکن اسی سے دل کو بے چینی بھی لاحق ہوتی ہے

اکثر بن جاتی ہے یہی آرام و سکوں کے لئے عذاب

آہ مری بینائی بھی رحمت کے روپ میں زحمت ہے

اس کی بدولت کبھی کبھی راحت ہوتی ہے قلب سے دور

بعض حقائق کے جلوے یوں کرتے ہیں بے تاب مجھے

خود کو میں گیتوں سے بہلانے پر ہو جاتی ہوں مجبور

آج بھی میں نے چھیڑا تھا اک گیت اسی مقصد کے تحت

جس کو سن کر چونک اٹھا تو، لرزے تیری فکر کے تار

میرے جگر کی ہلچل نے تجھ پر بھی دکھایا اپنا اثر

بحرِ تصور کو تیرے بھی، اس نے کیا طوفاں بہ کنار"

شاعر بولا "بجا ہے یہ ارشاد ترا اے ملکۂ شب

مگر ترے نغمے نے کہاں سے پایا اتنا درد بھلا؟

آدھے وقت کی رانی ہے تو، دیوی بھی کہتے ہیں تجھے

ایسے کون سے رنج ہیں جن کی گود میں تیرا گیت پلا؟"

سوز میں ڈوبے، مدھم سے لہجے میں، اس کو ملا جواب

"تیرے لئے اس راز کو بھی افشا کرتی ہوں اے ہمدم!

تین قسم کے دکھوں نے میرے نغمے کو بخشا ہے کرب

زلیست کا صدمہ، موت کی بے دردی کا الم، حالات کا غم"

ہو نہ سکی شاعر کی تسلی سن کر یہ دو چار الفاظ

بڑھا تجسس اور زیادہ، اس نے کیا پھر استفسار

ان آلام کا مطلب کیا ہے؟ بتا مجھے تفصیل کے ساتھ

جب تک سمجھ نہ لوں گا سب کچھ، کرتا رہوں گا میں اصرار"

رات کی دیوی بولی "شعراء ہوتے ہیں اجمال پسند
طول کلامی سے اس باعث باز رہی تھی میری زباں
لیکن اگر تیرے نزدیک ضروری ہے تصریح تو سن
اب میں اپنی بات کو واضح طور سے کہہ دیتی ہوں بیاں"

---

(۴)

"پہلی چیز جو میرے گیت میں بھر دیتی ہے حزن کا رنگ
قدرت کا اک تحفہ ہے "زندگی"، جسے کہتے ہیں لوگ
تحفوں سے ملتی ہے دل انساں کو عموماً خوشی، مگر
اس تحفے کو پا کے ہزاروں رنج و الم سہتے ہیں لوگ

عجب سی شے ہے زلیست، اگر پوچھے اس کی تعریف کوئی
جتنے منھ اتنی باتیں ہوں، جتنے ذہن اتنے ہوں خیال
اپنی اپنی سب کی ڈفلی اپنا اپنا سب کا راگ
جدا جدا ہر ایک کا سر اور الگ ہر سر کی تال
کرے جو تو معلوم کبھی سورج سے حقیقت ہستی کی
ممکن ہے وہ اس کو بتائے "نور وضیا کا گہوارہ"
کیوں کہ اسے دن بھر کرنیں رکھتی ہیں اپنے آنچل میں
فقط شعاعوں کی آغوش سے واقف ہے وہ بےچارہ

لیکن میں ہوں اندھیروں کی پروردہ، میری نظروں میں

کسی بھیانک کال کوٹھری سے بھی کہیں بدتر ہے حیات

میری زباں کیوں کر کہہ سکتی ہے پُرنور اسے آخر؟

جبکہ سدا دیکھا ہے میں نے اس کو تہہ دامِ ظلمات

کبھی کبھی محسوس مجھے کچھ ایسا ہوتا ہے گویا

زیست بھی میرے جیسی ہی اک شب ہے سیاہ و تیرہ و تار

جس کے مقدر میں لکھے ہیں دکھوں کے گھرے اندھیارے

دوش پہ جس کے غموں کی ظالم تاریکی رہتی ہے سوار

اکثر اس میں لمحاتی خوشیاں بھی ہویدا ہوتی ہیں

جیسے رات میں نکلا کرتا ہے دھندلا دھندلا مہتاب

عہد جوانی ان خوشیوں کے لئے ہے یوں نقطۂ عروج

شب چہار دہم کو چاند پہ ہوتا ہے جس طرح شباب

مگر یہ دل خوش کن وقفہ زندگی کا اصلی روپ نہیں

اس کی پشت پہ بھی آلام کی تلخ حقیقت ہوتی ہے

پل دو پل کے بعد بھلا چاندنی کا سیمیں حسن کہاں؟

رات کی قسمت اول ظلمت، آخر ظلمت ہوتی ہے

شاید تجھ کو یاد ہو صدیوں پہلے تیری دھرتی پر
گیانی اور اپدیشک بن کر لیا تھا اک انساں نے جنم
گوتم بھی کہتے تھے جسے ، سدھارتھ بھی تھی جس کی پدوی
کہا تھا اس نے سوچ سمجھ کر جیون کو "سروم دکھم"
زیست کی بابت اب تک میں نے سنی ہیں جتنی بھی رائیں
ان میں یہی اک رائے ہے ایسی جس کی نہیں ممکن تردید
جنھوں نے چشم بینا سے دیکھا ہے حیات گذراں کو
کرتے ہیں وہ اہل بصیرت اس سچائی کی تائید

اسی صداقت کا ادراک مجھے تڑپاتا رہتا ہے

اسی سے درد کا مخزن بن جاتے ہیں میرے قلب و جگر

یہی وہ سب سے پہلا دکھ ہے جس کی بدولت گیت میرا

نوحۂ غم بن کر سننے والوں پہ کیا کرتا ہے اثر"

۵

"دوسری شے جو کرب کا نشتر میرے دل میں چبھوتی ہے

موت کی وہ بے رحم گھڑی ہے، ممکن جس سے نہیں فرار

زیست کا ہر ہر لمحہ اس کے خوف سے سہما رہتا ہے

دہشت اس کی ہر ذی روح سے چھین لیا کرتی ہے قرار

ابھی ابھی زندگی کو میں نے کہا ہے اک مجموعۂ غم
ہو سکتا ہے ذہن میں تیرے پیدا ہو اس سے یہ سوال
زلیست ہے گر سروم دکھم تو موت ہوئی کیوں کر ظالم
کر دیتی ہے ختم جو اپنی آمد سے دکھ کا جنجال
مجھے بھی اکثر یہ منطق پھر دن الجھن میں رکھتی ہے
مگر میں جب دوڑاتی ہوں دنیا کی آبادی پہ نظر
غلط دکھائی دیتا ہے یکسر، مجھ کو یہ استدلال
کیوں کہ یہاں کے سب افراد ہیں زندہ رہنے کے خوگر

لاکھ ہوں اس میں رنج و مصائب پھر بھی ہے محبوب حیات

لوگ اذیت سہتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں

صدموں کی بہتات سہی، ان گنت سہی آفات وفتن

لیکن وہ زندگی کے چھن جانے سے ہمیشہ ڈرتے ہیں

موت کی آنکھوں میں کھٹکا کرتا ہے یہ وصف محبوبی

اسی لئے پرخاش و عداوت رکھتی ہے بے درد سدا

زیست پہ جب کمبخت کا چل جاتا ہے اچانک داؤں کبھی

زہر فنا دے کر اس کو، دشمنی کا حق کرتی ہے ادا

پیر و جواں پر اس کے مظالم یکساں طور پہ ہوتے ہیں
شیر خوار بچوں پر بھی چلتے ہیں اس کے تیر ستم
اجڑے کسی سہاگن کا گھر، یا سونی ہو گود کوئی
میدان تخریب میں اونچا ہی رہتا ہے اس کا علم
کچھ دن پہلے دیکھے تھے وہ ایسے مناظر میں نے، جنھیں
بھول نہیں سکتی میں ہرگز، اگر بھلانا چاہوں بھی
ذہن سے ان کے نقش کا مٹنا اس صورت میں بھی محال
جب کہ میں ہر ممکن تدبیر سے انھیں مٹانا چاہوں بھی

شہر کی روشن شاہ راہ پر ایک طرف تھا یہ منظر
اک دکھیاری ماں اپنے آنچل میں لئے طفل بیمار
گرتی پڑتی ٹبھی چلی جاتی تھی شفاخانے کی سمت
تاکہ معالج کی کوشش سے دور ہو بچے کا آزار
پیچھے پیچھے رواں دواں تھی موت بھی اس انداز کے ساتھ
غیض و غضب سے آنکھ میں سرخی، لبوں پہ کف، ابروؤں میں خم
پہنچی جب وہ دارالشفا کے پاس تو ایسا وار کیا
ہچکی لے کر ماں کی گود میں توڑ دیا معصوم نے دم

دوسری جانب اپنا ٹھکانا کھو کر اک زخمی ہرنی

جنگل کی تاریک فضا میں بھٹک رہی تھی ادھر ادھر

پشت پہ اس کی، ایک درندے کی صورت میں موت بھی تھی

جبر و تشدد پر آمادہ ، سفاکی پر کسے کمر

غافل پا کر بے چاری ہرنی کو، لگائی جست اس نے

پنجوں سے گردن کو دبوچا، دانتوں سے کاٹا حلقوم

جسم کو اس کے چیر پھاڑ کر جلدی جلدی کھا ڈالا

چشم زدن میں بنی اجل کے منہ کا نوالہ وہ مظلوم

ان دونوں حادثوں سے دل کو پہنچا ہے ایسا صدمہ
بزم جہاں کی ساری رونق لگتی ہے مجھ کو بے کار
موت کی بے دردی کا الم یوں حاوی رہتا ہے مجھ پر
سدا مرے نغمے میں نمایاں ہوتے ہیں غم کے آثار "

٦

"مجھ کو حیات و مرگ کی فکریں رکھتی ہیں بے چین ، مگر
اپنی روش پر ازل سے اب تک قائم ہے دنیا کا نظام
زمیں کے دامن میں آباد ہیں صدہا قسم کی مخلوقات
آدم کی اولادوں کا ہے جن میں سب سے خاص مقام

ان کے مشاغل دیکھ کے میں ہو جاتی ہوں محوِ حیرت

سعی و عمل ہے شیوہ ان کا، چاہے نہ ہو کچھ بھی حاصل

جوشِ طلب کی لہروں پر رہتی ہے رواں کشتی ان کی

بلا سے مل پائے نہ کبھی تکمیلِ مقاصد کا ساحل

انسانوں کی جہدِ مسلسل اپنی حقیقی صورت میں

سنا ہے میں نے، دن کے اجالے میں آیا کرتی ہے نظر

روزِ طلوعِ سحر سے لے کر آفتاب کے چھپنے تک

بھوت چڑھا رہتا ہے "کام" کا ان بے چاروں کے سر پر

ان کی مشقت دن بھر کی ہوتی ہے برائے شکم پری
لیکن میری سمجھ سے یہ مقصد بھی ادھورا رہتا ہے
انسانوں کا اک طبقہ جی جان سے محنت کر کے بھی
کارگہِ عالم میں ہمیشہ بھوک کی کلفت سہتا ہے
مگر وہ سارے کام کئے جاتے ہیں جو روز روشن میں
میرے لئے تشویش و تفکر کا باعث بنتے ہیں کم
کیوں کہ انھیں انجام دیا کرتے ہیں ایسے وقت میں لوگ
جب کہ نہیں رکھنے پاتی میں صحن جہاں میں اپنے قدم

کرتے ہیں مجھ کو متفکر ایسے انسانی افعال

جلوہ نما دنیا میں جو ہوتے ہیں میرے آنے کے بعد

جن کو سکوت و ظلمت میں پروان چڑھایا جاتا ہے

سورج کی نظروں سے چھپا کر، شام کے ڈھل جانے کے بعد

یوں تو مرے آتے ہی عموماً کائنات میں ہر جانب

اضمحلال سا چھا جاتا ہے، تھکن کا ہو جاتا ہے راج

نیند کی پریاں دہر میں پھیلا دیتی ہیں سپنوں کے جال

ڈھونڈنے لگتا ہے آغوش خواب کو انسانوں کا سماج

لیکن نوعِ بشر کی سیمابی فطرت کی جولانی

سونے سے پہلے بھی دکھایا کرتی ہے اپنی چھل بل

یعنی بستر پر جانے سے قبل بھی باشندگانِ ارض

رکھتے ہیں کچھ دیر زمانے میں خود کو سرگرمِ عمل

ان کے جن اعمال کا کرتی ہیں میری آنکھیں دیدار

پیٹ کی خندق بھرنا ان کا نہیں ہوا کرتا مقصود

بلکہ سکوں روحِ بے تاب کو پہنچانا، ہے ان کی غرض

حیف مگر یہ غرض بھی آخر ثابت ہوتی ہے بے سود

مے خانے سے معبد تک جس سمت بھی دوڑاتی ہوں نگاہ

روحانی راحت کی تلاش لاحاصل آتی ہے نظر

اس کے مظاہر دیکھ کے مجھ کو سخت اذیت ہوتی ہے

دل پر میرے رنج والم کا شدت سے ہوتا ہے اثر

آج ہی میں نے چند مناظر ایسے دیکھے ہیں، جن میں

پنہاں تھا مدعا یہی، پوشیدہ تھی جستجو یہی

لے میں تجھے تفصیل سے ان کا حال سنائے دیتی ہوں

سب کچھ تجھ پہ عیاں ہو جائے، اب ہے مری آرزو یہی

میں نے دیکھا، ایک شرابیِ بنت عنب کے نشے میں چور

بہکے بہکے قدموں سے مے کدے سے نکلا پیئے ہوئے

ہونٹوں پر وہ پیاس جو بجھ پائی نہ چڑھا کر جام پہ جام

آنکھوں میں ازلی تشنگی کے گہرے سائے لئے ہوئے

چاہا تھا اس نے کہ علاج سوز نہاں ساغر سے کرے

لیکن روح کے تپتے لبوں کو ٹھنڈا کر پائی نہ شراب

سیال آتش سے احساسات کی حدت اور بڑھی

دوا سمجھ رکھا تھا جس مشروب کو وہ بن گیا عذاب

بدمستی میں گھنٹوں گلی گلی کی چھانی خاک ، مگر

مل نہ سکی مے کش کو کسی کوچے میں کوئی جائے تسکیں

لاچاری کے عالم میں یاد آیا خود اپنا ہی مکاں

دھیرے دھیرے گھر کی سمت چلا وہ لے کر قلب حزیں

دروازے پر پہنچ کے جھلاہٹ میں زور سے دستک دی

گہری نیند سے بیوی چونک کے اٹھ بیٹھی، سن کر آواز

باہر جاکر، دے کے سہارا ، پیار سے اندر لائی اسے

قسم خدا کی ، جھوم گئی میں دیکھ کے اس کا یہ انداز

لیکن میری خوشی تاسف میں فوراً ہی بدل گئی

دبی زباں سے، نیک بخت نے، شوہر سے کچھ گلہ کیا

اس کی شکایت پر مے خوار کے ذہن کی تلخی ہوئی فزوں

پاگل ہو کر غصے سے، بیوی کو اس نے پیٹ دیا

جھٹکے پٹکے ہاتھ پاؤں مظلوم نے، کی فریاد مگر

ظالم مرد کے غیض و غضب نے ایک نہ عورت کی مانی

روئی دھوئی کچھ لمحوں تک، پھر منہ ڈھانپ کے لیٹ رہی

مار پیٹ کر دکھیا کو مے نوش نے بھی لمبی تانی

اس حالت میں انھیں جو دیکھا، ترس مجھے آیا ان پر
دونوں کے سینے تھے زخمی، جگر تھے دونوں کے گھائل
سکوں کی منزل پانے کی ناکام تمنا دل میں لئے
دونوں کی روحیں دنیائے خواب کی جانب تھیں مائل

رقص گاہ میں اک محلوں کا پروردہ نوخیز جوان
بیٹھا ہوا تھا بدصورت سی بازاری عورت کے ساتھ
چوم رہا تھا بار بار خوشبو میں بسی ہوئی زلفیں
پوڈر سے چمکائی ہوئی گردن میں ڈالے ہوئے تھے ہاتھ

قرب سے صنفِ نازک کے، ناواقف نہیں تھا وہ عیاش

چند مہینے پہلے ہی لایا تھا ایک حسین دلھن

بیگم اس کی رشکِ قمر تھی، رنگ و روپ تھا ہوش ربا

رخساروں کی شادابی سے شرمندہ ہوتا تھا چمن

پھر بھی نہ جانے کیوں وہ جنسی طور پہ رہتا تھا بھوکا

روز کسی مکار طوائف سے جی کو بہلاتا تھا

رسوائی سے بے پروا ہو کر ہاتھوں میں ہاتھ لئے

تفریحی مرکزوں پہ اس کو ساتھ ٹہلاتا تھا

آج بھی اک بدنام فاحشہ زینت بنی تھی پہلو کی

صحبت جس کی ، ناچ دیکھنے کا دل چسپ بہانہ تھی

پائل کی جھنکار میں کچھ بھی کشش نہیں تھی اس کے لئے

بکنے والے جسم کی لذت ہی بس اس کا نشانہ تھی

ختم ہوا جب رقص تو وہ فاحشہ کے نخروں کو سہتا

وہاں سے رخصت ہوکر ایک مسافر خانے میں آیا

تنہائی میں اس بدچلن سے منہ کالا کرنے کے بعد

دے کے اسے دو چار چمکتے سکے ، چھٹکارا پایا

تھکا تھکا سا ہوا روانہ پھر اپنے بنگلے کی طرف
خواب گاہ میں پہنچ کے فوراً بستر پہ ہو گیا دراز
سوئی ہوئی بیگم کی خاموشی نے پکارا غافل کو
لیکن وہ سن سکا نہ اس کے بند لبوں کی یہ آواز
سو جانے کی خواہش نے مضطرب اسے رکھا پہروں
ہر کروٹ پہ ناآسودہ دل سے ابھرتی تھی فریاد
جسمانی راحت کی راہ تو پیدا کر لی تھی اس نے
روح مگر ہو گئی تھی پہلے سے بھی کچھ بڑھ کر ناشاد

رفتہ رفتہ لیکن اس کی پلکیں بوجھل ہو ہی گئیں
دامن میں خواب غفلت کے، مل ہی گئی اس کو بھی پناہ
خفتہ پا کر اس نوجواں کے وحشت زدہ سے تن من کو
ٹھنڈی سانس بھری میں نے، سینے سے میرے نکلی آہ

اک پادری کلیسا میں پڑھ رہا تھا آیات انجیل
مریم کی تصویر کے آگے کیے ہوئے شمعیں روشن
بار بار افکار پہ کچھ حسرتوں کی یوں پڑتی تھی چھاؤں
جیسے کسی مقبرے پہ ہوں ارواح خبیثہ سایہ فگن

گھونٹ دیا تھا اس نے نہ جانے کتنے ارمانوں کا گلا
ضبط کے خنجر سے کر ڈالا تھا صدہا خواہشوں کو قتل
بھوتوں کی شکلوں میں وہی مردہ جذبے تنہائی میں
دکھا رہے تھے اپنے بھیانک چہرے اب اس کو دراصل
ڈھونڈ رہا تھا گھبرا کر وہ الہامی فقروں میں اماں
لیکن ان بھوتوں کی پرچھائیں سے نہ مل پاتی تھی نجات
روح میں تھی بے چینی سی ، ادراک میں پیچ و تاب سا تھا
سکوں کی نعمت دینے سے قاصر تھے متبرک کلمات

عاجز آکر بند کیا انجیل کو اس نے آخر کار

فرش پہ ٹانگیں پھیلا دیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا

نیند نے آہستہ آہستہ جکڑ کے اپنی باہوں میں

اس کے محسوسات کا ہوش و خرد سے ناتا توڑ دیا

انسانوں کے ان حالات پہ رونا آتا ہے مجھ کو

میرے گیت کی درد انگیزی کا یہ بھی بنتے ہیں سبب

شاید اب تو سمجھ گیا ہوگا ان تینوں صدموں کو

جن کی بدولت ہوتا ہے غمگین ہمیشہ نغمۂ شب "

۷

سنا چکی جب رات کی دیوی اپنے غموں کا افسانہ
فضا پہ طاری ہوئی خموشی، چھایا اک پر ہول سکوت
اس کے چپ ہوتے ہی ختم ہوا وہ سوز میں ڈوبا گیت
جس کے تاثر نے اب تک ماحول کو رکھا تھا مبہوت

شاعر کے جذبات میں پیدا ہوئی اچانک ہلچل سی
بے تابی کے عالم میں نکلی اس کے ہونٹوں سے کراہ
آنکھیں بھی مضطرب ہوئیں، نظروں میں بھی جاگی تشویش
پہلے ادھر ادھر دیکھا، پھر سوئے افق دوڑائی نگاہ
وہاں دکھائی دیئے نمود صبح کاذب کے آثار
رفتہ رفتہ تاریکی کچھ پھیکی پڑتی جاتی تھی
گھلتا جاتا تھا ہلکا ہلکا سا نور سیاہی میں
سحر کی صورت ظلمت کے پردوں سے ابھرتی آتی تھی

دیکھ کے یہ تبدیل شدہ منظر ایسا محسوس ہوا

گویا رات کی دیوی نے کر لیا ارادہ رخصت کا

کیوں کہ اجالے کائنات پر قابض ہونے والے تھے

نام و نشاں مٹنے والا تھا اس کے عہد حکومت کا

چند ساعتوں بعد ہوئی خوابیدہ دنیا متحرک

انسانوں کی آبادی میں لہر اٹھی بیداری کی

آفتاب نے فرش زمیں پر بھیج کے روشن کرنوں کو

اولاد آدم کے لئے "کاموں" کی ہدایت جاری کی

گرم ہوا بازار مشقت کا، پھر جہاں میں ہر جانب

نوع بشر کی فطرت پھر ہو گئی اسیر دام محن

وہی پرانی بھاگ دوڑ پھر چاروں طرف ہوئی ظاہر

کارگہ عالم میں چلی پھر سعی و عمل کی رسم کہن

شاعر کے ہونٹوں پر اک مغموم تبسم پھیل گیا

دبا دبا سا طنز بھی اس کے خندۂ غم میں تھا شامل

بد دل ہو کر، آبادی کی سمت سے پھر وہ پھیر کے رخ

چلا ڈھونڈنے دھندلی راہ پہ خوابوں کی منزل

آہستہ آہستہ اوجھل ہوا نظر سے عکس اس کا
ہوتے ہوتے خلا میں اس کی پرچھائیں تحلیل ہوئی
جس قصے کی داغ بیل ڈالی تھی شب کی ظلمت نے
صبح درخشاں کی آمد پہ یوں اس کی تکمیل ہوئی

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE



Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

گنجِ سوختہ

۱۹۵۹ سے ۱۹۶۹ تک کا منتخب کلام

شمس الرحمٰن فاروقی

ساتواں در

شہریار

(مجموعۂ کلام)

زیرِ طبع

شب خون کتاب گھر الہ آباد ۳